سوال نمبر 2 (الف) (i)

بات لینے کا حق نہ رکھنا

راحت صاحب اور خواجہ صاحب اپنی بیگمات کے مابین ہونے والی لڑائی میں کچھ کہنے یا مداخلت کرنے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ ان کے مطابق جس طرح محلے میں چھان بورا بیچنے والے کو نہ جھنگھاڑنے کا نہیں کہا جا سکتا ویسے ہی بیگمات کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آپس میں لڑائی نہ کریں۔

سوال نمبر 2 (الف) (ii)

محلے کے بزرگ کی صلاح

محلے کے بزرگ نے دونوں صاحبوں کو یہ صلاح دی کہ وہ اپنی بیگمات کو لڑائی جھگڑے سے روکیں کیونکہ راجہ صاحب اور خواجہ صاحب کی بیگمات کے مسلسل ہونے والے جھگڑوں سے محلے کا نام بدنام ہو رہا تھا۔

سوال نمبر 2 (الف) (iii)

راجہ صاحب کا عذر

محلے کے بزرگ کو راجہ صاحب نے یہ عذر پیش کیا کہ دونوں بیگمات کی لڑائی عورتوں کا معاملہ ہے وہ اُس میں مداخلت کرتے اچھے نہیں لگیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ جہاں دو برتن پڑے ہوں تو ان کے ٹکرانے سے بھی آوازیں آتی ہیں وہ تو پھر جیتی جاگتی عورتیں ہیں۔ یعنی ان کا لڑنا کچھ زیادہ عجیب نہیں ہے۔ راجہ صاحب نے بزرگ کو صلاح دی کہ وہ اپنی بیگم صاحبہ کو بھیج کر اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کریں۔

سوال نمبر 2 (الف) (iv)

جھگڑے سے لطف نہ آنا:

بیگمات کے لڑائی جھگڑے میں الزام تراشی بہت کم ہوتی تھی اور بد دعائیں زیادہ ہوتی تھیں۔ جس کی وجہ سے محلے والوں کو لڑائی جھگڑے سے کچھ زیادہ لطف حاصل نہیں ہوتا تھا۔ عام طور پر اگر لوگ لڑائی جھگڑے یا بحث و مباحثے میں ایک دوسرے پر الزام لگائیں، برا بھلا کہیں یا گالم گلوچ سے کام لیں تو تب ہی لوگوں کو جھگڑے سے لطف حاصل ہوتا ہے۔ مصنف نے معاشرے کی اسی برائی پر طنز کیا ہے۔

سوال نمبر 2 (الف) (۷)

رموزِ اوقاف کی نشاندہی کریں

عبارت میں سکتہ، رابطہ، واوین اور ختمہ جیسے رموزِ اوقاف کا استعمال ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل جملہ ملاحظہ ہو۔

ایک بار محلے کے ایک بزرگ نے دونوں کو روک کر کہا: "آپ بھلے لوگ ہیں اپنی بیگمات کو لڑائی جھگڑے سے روک لیئے، پورا محلہ بدنام ہو رہا ہے۔"

سوال نمبر 2 (الف) (vi)

سوال نمبر 2 (ب) (i) **پہلے شعر میں شاعر کا پیغام:**

پہلے شعر میں شاعر اپنے وطن کے نوجوانوں کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ انہیں ریاکاری، فریب، لالچ، حرص اور بغض سے اجتناب کرنا چاہئیے۔ شاعر کے مطابق ترقی کرنے اور کامیابی پانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے درمیان موجود ان برائیوں سے نجات پالیں۔ شاعر یہ پیغام دے رہے ہیں کہ انسان کو مکروفریب، ریاکاری، لالچ اور حرص کے بتوں کو توڑ کر محبت، اخلاص، حسن سلوک کو اپنا شیوہ بنانا چاہئیے۔

سوال نمبر 2 (ب) (ii) **دوسرے شعر کا مفہوم:**

"اے وطن کے نوجوانو! اپنی مکروفریب، ریاکاری اور دیگر معیوب عادتوں سے چھٹکارا پاکر صرف اور صرف وطن کی ترقی کے لئے کوشش کرو۔"

شاعر کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں معاشرے سے ریا، فریب، لالچ، حرص اور دیگر برائیوں سے نجات پاکر صرف اور صرف اپنے وطن کی ترقی کے لئے کام کرنا چاہئیے۔

سوال نمبر 2 (ب) (iii) **صنعت کی نشاندہی:**

شاعر نے نظمیہ جزو میں **صنعتِ تکرار** استعمال کی ہے۔

اپنی یہ طرفہ ادا چھوڑ بھی دیں چھوڑ بھی دیں
آؤ کچھ کام کریں، آؤ کچھ کام کریں

وضاحت: تکرار کے معنی ہیں "بار بار دہرانا"۔ جب شاعر اپنے شعر کو خوبصورت بنانے کے لئے لفظوں کو بار بار دہراتا ہے تو یہ صنعتِ تکرار کہلاتا ہے۔ مندرجہ بالا شعر میں شاعر نے "چھوڑ بھی دیں، چھوڑ بھی دیں" اور "آؤ کچھ کام کریں، آؤ کچھ کام کریں" کی تکرار کی ہے۔

سوال نمبر 2 (ج) (i)

ماضی اور حال کے انسانوں کے درمیان فرق:

شاعر کہتے ہیں کہ پہلے زمانے میں تو لوگ پتھر کو بھی خدا مان کر اس کی پوجا کرتے تھے اور اس کو عزت و تکریم دیتے تھے۔ ماضی میں تو پتھر جیسی بے جان چیز کا بھی اتنا رتبہ تھا لیکن آج کل تو لوگ انسان کو بھی انسان ہونے کا درجہ نہیں دیتے۔ ہر جگہ انسانیت اور آدمیت کی تذلیل ہو رہی ہے۔ انسان اپنی معراج سے گر چکا ہے۔ ایک طرف انسان غربت کا شکار ہیں، تڑپ رہے ہیں اور دوسری طرف امراء و حکمران عیش کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سوال نمبر 2 (ج) (ii)

محبوب کا در چھوڑنے سے مشکلات:

ایک عاشق کے لیے اس کے محبوب کا در اس کی کل کائنات ہوتا ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ اے میرے محبوب! اگر تیرا در مجھ سے چھوٹ گیا تو میرا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ مجھے ایسے محسوس ہوگا کہ میں قید ہو گیا ہوں۔ یا میں مجنوں کی طرح صحرا میں بکھر جاؤں گا۔ ریگستانوں کی خاک چھانوں گا۔ یعنی محبوب کا در چھوڑنے سے شاعر کو یہ مشکل ہو گی کہ اس کے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا اور وہ اپنا وجود کھو کر جنگلوں اور ریگستانوں میں بھٹک جائے گا۔

سوال نمبر 2 (د) (i)

رابطہ

اگر جملے میں وقفہ سے زیادہ ٹھہرنا مقصود ہو تو رابطہ کی علامت لگائی جاتی ہے۔ اسے **وقفِ لازم** بھی کہتے ہیں۔ رابطہ کی علامت ہے **:**

- کسی کا قول نقل کرنا ہو یا سابقہ بات کی تشریح کرنی ہو تو رابطہ کی علامت لگاتے ہیں۔ مثلاً:

قائدِ اعظمؒ فرماتے ہیں: "کام کام اور صرف کام"۔

امی نے کہا: "علی سو جاؤ"۔

- دو مقابل جملوں کے درمیان رابطہ کی علامت لگائی جاتی ہے اگر ان دونوں میں کوئی لفظ جوڑنے کے لئے استعمال نہیں کیا گیا۔ مثلاً

وہ وعدے تو کرتا ہے: یاد نہیں رکھتا۔

سوال نمبر 2(د) (ii)

امدادی فعل کا جملوں میں استعمال

سکنا: کاش وہ میری بات سمجھ **سکتی**۔

چاہنا: میں اپنا کام سکون سے کرنا **چاہتی** ہوں۔

اٹھنا: اسلم اپنے بیٹے کی شکایت پر غصّے میں تلملا **اٹھا**۔

سوال نمبر 3 (صفحہ نمبر 1)

پیراگراف کی تشریح:

لیکن ریل کا سفر محض ------ اشیا خریدنے کے لئے دباؤ ڈال سکیں۔

یہ پیراگراف سبق "ریل کا سفر" سے لیا گیا ہے۔ اس کے مصنف نے ریل کے سفر کی خصوصیات بتائی ہیں۔ اور ایک نت نئے انداز میں ریل کے سفر کو بیان کیا ہے جس کی وجہ سے موضوع کی جدت میں اضافہ ہوا ہے۔ ریل کا سفر بعض اوقات دور دراز علاقوں میں سفر کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اس سفر سے زیادہ تر وہی لوگ مانوس ہوتے ہیں جو مالی طور پر کچھ کمزور ہوتے ہیں۔ ریل میں اکثر بھیڑ زیادہ ہوتی ہے۔ بقول شاعر:

صراحی سے گھڑا روٹی سے دسترخوان لڑتا ہے
مسافر خود نہیں لڑتا مگر اس کا سامان لڑتا ہے

تشریح طلب پیراگراف میں مصنف لکھتے ہیں کہ ریل کا سفر محض آس پاس تیزی سے گزرتے مناظر سے لطف اٹھانے تک محدود نہیں ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ اصل میں ٹرین کا مزہ تو تب آتا ہے جب گاڑی کسی اسٹیشن پر چند لمحوں کے لئے رکتی ہے۔ یہ اسٹیشن دراصل **ننھے جزیروں** کی مانند ہوتے ہیں۔ جزیرہ خاموش سمندر کے وسط میں موجود چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ چونکہ اسٹیشن بھی ایک چھوٹا زمین کا ٹکڑا ہوتا ہے جسے لوگ کچھ دیر کے لئے آباد کرتے ہیں اور اس اسٹیشن نما جزیرے کے کنارے گاڑی لحظہ بھر کو رکتی ہے اور پھر چل پڑتی ہے۔ لہذا یہ اسٹیشن جزیرے ہیں جو **حرکت اور سکوت** کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہیں۔ حرکت سے مراد چلتی ہوئی ریل گاڑی جبکہ سکوت سے مراد ٹھہرا ہوا اسٹیشن ہے۔ لیکن مصنف لکھتے ہیں کہ یہ جزیرے **خاموش**

نہیں ہوتے۔ اس میں ایک ہی وقت میں زندگی اپنی تمام تر چہل پہل، رنگینیاں، رعنائیاں دکھاتی ہیں۔ اگرچہ ٹرین نسبتاً تیز چلتی ہے اور اس کی آواز زیادہ ہوتی ہے مگر کھڑے پر معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی چہل پہل اور گہما گہمی اسٹیشنوں پر زیادہ ہے۔ بقولِ شاعر:

ہے سرسری سا تم جہاں سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

آخر میں مصنف نے ٹرین کے سفر کی ایک اور خاص بات کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ٹرین کسی بڑے اسٹیشن پر رکتی ہے تو ٹرین کی کھڑکی کے ساتھ ایک ریڑھی والا آ کھڑا ہوا۔ جو باآوازِ بلند اپنی چیزوں کو خریدنے کی دعوت اور گزارش کرتا ہے۔ مصنف کے مطابق ان لوگوں کا ماننا ہے:

"جتنی تیز آواز لگائی جائے، گاہک اتنا ہی چیزیں خریدنے پر مجبور ہوتا ہے۔"

یہ ریڑھی والے اپنا پورا زور لگا کر آواز نکالتے ہیں تاکہ لوگ ان کی چیزوں کو خریدیں اور ان کا دن بسر ہو سکے۔ اگرچہ یہ آواز زیادہ بھلی معلوم نہیں ہوتی مگر اصل میں ٹرین کے سفر کے لطف اور ٹرین اسٹیشن کی گہما گہمی میں ان **بانٹنے والوں کا بہت زیادہ حصہ ہوتا ہے۔** یہ اصل میں ٹرین اسٹیشن کی رونق کو **چار چاند لگاتے ہیں۔**

اس سب میں مصنف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ریل کا سفر محض ارد گرد کی چیزوں کو دیکھنا ہی نہیں بلکہ خدا کی مخلوق اور اس کی بنائی ہوئی **کائنات کی رنگینیوں اور چہل پہل کا مشاہدہ کرنے کا بہترین ذریعہ** اور اس میں دراصل اس سفر کا حسن

سوال نمبر 4 (صفحہ نمبر 1)

نظمیہ جزو کی تشریح:

یہ نظمیہ جزو ن - م - راشد کی نظم "ستارے" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے ستاروں کو ان کی روایتی خوبصورتی سے ہٹ کر ایک نئے انداز میں بیان کیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ ستارے رات کے وقت آسمان کو روشن، منور اور خوبصورت بناتے ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ رات کے سیاہ دامن میں موتی ٹکے ہوئے ہوں۔ بقول شاعر:

ے حسن ازل ہے پیدا، ستاروں کی دلبری میں
جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی عارسی میں

تشریح طلب اشعار میں شاعر کہتے ہیں کہ چاند ستاروں والی جنت سے ایک نغموں کی ندی آرہی ہے جو آہستہ آہستہ فضا کی وسعتوں کو طے کرکے زمین کی طرف سفر میں جاری و ساری ہے۔ دراصل اللہ نے جب انسان کو تخلیق کیا تو اسے جنت میں رکھا۔ تب انسان ان تمام آسمانی چیزوں سے مانوس تھا اور یہ سب چیزیں انسان کی دوست تھیں۔ مگر اس کے بعد انسان نے اللہ کے حکم کے تحت زمین پر قدم رکھا تو اللہ نے جنت کی چیزوں کا کچھ عکس زمین پر بھیج دیا۔ یہ **چاند اور ستارے دراصل جنت کا عکس ہیں جو انسان کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ انسان کا اصل مقام جنت ہے۔"** ان ستاروں سے نکلنے والی ندی میں ایک ہی نغمہ ہے کہ انسان کا مقام زمین نہیں بلکہ آسمان ہے اور جنت ہے: بقول شاعر:

ے ممکن ہے فضاؤں سے خلاؤں کے جہاں تک
جو کچھ بھی ہو آدم کا نقشِ کف پا ہو

سوال نمبر 4 (صفحہ نمبر 2) یہ نغموں کی ندی آسمان کی وسعتوں کو طے کرتے ہوئے آہستہ آہستہ زمین کی طرف آ رہی ہے۔ شاعر نے زمین کو **نوحہ آبادِ جہاں** کہا ہے جس کا مطلب ہے **دکھوں اور مصیبتوں کا گھر**

اللہ نے انسان کو زمین پر ایک آزمائش کے طور پر بھیجا اور انسان پر یہ بات واضح کر دی کہ اب جنت حاصل کرنے کے لئے محنت کرنی ہو گی۔ یہ زمین جو دراصل انسان کے لئے امتحان کی جگہ ہے، جہاں انسان ہر روز تڑپ رہا ہو۔ زمین پر ہر جگہ انسانیت کی تذلیل ہو رہی، انسان انسان کا دشمن ہے۔ ہر طرف فتنہ فساد اور خون کا بازار گرم ہے۔ ایسی دنیا میں جب یہ جنت سے نکلنے والے نغمے اور روشنی کی ندی پہنچتی ہے تو یہ دنیا سے رنج و الم کے بادل کو دور کرتی ہے۔ یہ ستارے دراصل انسانوں کی رہنمائی کرتے ہیں کہ وہ **محنت کر کے اس دنیا کو اپنے لئے جنت بنائیں۔ اس کو امن، سکون، محبت کا گہوارہ بنائیں۔**

یہ ستارے مخلوقِ خدا کے لئے جہاں سکون کا باعث ہیں وہیں یہ رہنمائی کا سبب ہیں۔ اس سے انسان اپنے مقصد سے مکمل باخبر رہتا ہے۔ بقول شاعر:

اے شب کے پاسبانو، اے آسماں کے تارو
تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمہاری

لہٰذا شاعر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ستاروں سے نکلنے والی روشنی جنت سے نکلنے والا ترانہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اس کی گمشدہ میراث یعنی جنت حاصل کرنے کے لئے

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 1)

غزلیہ حصے کی تشریح:

ظرف اتنا بھی کشادہ نہیں اپنا، لیکن
ہم نے پیدا بھی ہوتی ہے تو شکایت نہیں کی

تشریح:

یہ شعر ظفر اقبال کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ شعر روایتی غزلیہ شاعری کی عکاسی کرتا ہے۔ شاعر اپنے محبوب سے شکوہ کر رہا ہے کہ اگرچہ میرا برداشت کا مادہ زیادہ نہیں ہے۔ میرا ظرف اتنا کشادہ نہیں ہے کہ میں لوگوں کی غلطیوں کو معاف کر دوں۔ لیکن اس کے باوجود تیری طرف سے مجھے جو تکلیفیں اور دکھ ملے ہیں، شکوہ ہونے کے باوجود بھی میں نے تجھ سے کبھی شکایت نہیں کی۔ بلکہ تیرے زخموں کو صبر سے برداشت کیا ہے بقول شاعر:

ظرف میرا، میری ہمت دیکھ کر
جھوم لیتے ہیں پیمانہ میرا

محبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ عاشق ہر تکلیف کو سہہ جائے اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔ اگر عاشق محبوب سے بار بار شکوہ کرتا ہے۔ واویلا کرتا ہے تو یہ محبوب اور محبت کی توہین ہے۔ اس لئے شاعر کہہ رہے ہیں کہ اے میرے محبوب! میں نے محبت کا ہر تقاضا نبھایا ہے۔ تکلیف ملنے کے باوجود تجھ سے شکوہ و شکایت نہیں کی۔ بلکہ صبر سے برداشت کیا ہے۔ بقول شاعر:

پاس ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تلے آئے تھے

یعنی شاعر کو شکایت تو ہے مگر وہ حرفِ شکایت زبان پر نہیں لانا

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 2) ے یہ بھی سچ ہے کہ تیرے ہم بھی سوالی نہ ہوئے
اور تو نے بھی، کبھی کوئی عنایت نہیں کی

تشریح :

یہ شعر ظفر اقبال کی غزل سے لیا گیا ہے۔ اس شعر میں شاعر نے انا اور خودداری کا ذکر کیا ہے۔ عام طور پر عاشق محبوب سے محبت کی بھیک مانگتے ہیں۔ محبوب کے سامنے گڑگڑاتے نظر آتے ہیں۔ محبوب کی ایک ایک دید کے لئے کھٹکتے ہیں مگر شاعر کہتے ہیں کہ میرا انداز کچھ اور ہے۔ میں محبت تو کرتا ہوں لیکن میری خودداری مجھے اس سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میں نے محبوب سے کبھی محبت اور انسیت کی بھیک نہیں مانگی۔ بقولِ شاعر:

ے وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

شاعر کہتے ہیں کہ میں نے محبوب سے کبھی بھیک نہیں مانگی تو اے محبوب تو نے بھی مجھ پر کبھی کوئی عنایت نہیں کی۔ کبھی میرا نام محبت سے نہیں لیا۔ میں تو انا کی وجہ سے بھیک نہیں مانگ سکتا مگر تو نے بھی مجھے بغیر مانگے کچھ نہیں دیا۔ دنیا کا دستور بھی یہی ہے کہ مانگے بغیر کچھ نہیں ملتا۔ محبت تو پھر دور کی بات ہے۔ عاشق نے جب محبوب سے درخواست نہیں کی تو محبوب نے بھی کبھی اسے کچھ عنایت کرنے کا سوچا ہی نہیں۔ بقولِ شاعر:

ے مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 3) ؎ ہو رہا ہے جو اسی طرح سے ہونا تھا یہاں
اس لئے ہم نے کسی بات پر حیرت نہیں کی

تشریح:

یہ شعر ظفر اقبال کی غزل سے لیا گیا ہے۔ اس شعر کو دو معنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ **عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی** دونوں رنگ اس میں غالب ہیں۔

عشقِ مجازی میں شاعر کہتے ہیں کہ یہ تو ماضی کا دستور چلا آ رہا ہے کہ محبوب سنگدل ہوتا ہے۔ عاشق تڑپتا رہتا ہے مگر محبوب کو اپنے عاشق پہ ترس نہیں آتا۔ محبوب ظلم کرتا ہے اور عاشق اس کو چپ چاپ برداشت کرتا ہے۔ اس لئے اے میرے محبوب! تیرا جو میرے ساتھ رویہ ہے اس پہ مجھے ذرا حیرت نہیں ہوتی۔ عاشق کی قسمت میں یہ ظلم لکھا ہوتا ہے۔ جیسا ہو رہا ہے ایسا ہی ہونا تھا۔ محبوب ظلم کرتا ہے اور عاشق اسے صبر سے برداشت کرتا ہے۔ اس لئے تیرے سلوک پر مجھے کبھی حیرت نہیں ہوتی۔ بقول شاعر:

؎ ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے کہ وفا کیا ہے

دوسری طرف شاعر کہتے ہیں کہ میرے حصے میں جو تکلیفیں اور مصائب آئے ہیں یہ سب تو پہلے سے میری قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ ایک مسلمان ہونے کے ناطے میرا یہ ایمان ہے **"ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے"**۔ اس لئے اپنے ساتھ ہوئی تکلیفوں پر میں نے کبھی حیرت کا اظہار نہیں کیا کیونکہ ایسا ہی ہونا لکھا تھا۔ بقول:

؎ لائی حیات، آئے قضا لے چلی چلے
نہ اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی سے چلے

سوال نمبر 6 (صفحہ نمبر 1) **درخواست**

بخدمت جناب ضلعی ناظم، ضلع ا-ب-ج

عنوان: **دیہات میں مرکزِ صحت کا قیام**

جنابِ عالی!

مؤدبانہ گزارش ہے کہ ہمارے دیہات د-ذ-ذ میں صحت کی سہولیات ناقص ہیں۔ لوگوں کو علاج کروانے کے لیئے بہت دور دراز علاقوں میں جانا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے اکثر لوگ وقت پر علاج نہ ملنے پر دم توڑ دیتے ہیں۔ اس علاقے میں ہسپتال تو دور کی بات ایک ایسا مرکز صحت بھی نہیں جہاں لوگ اپنا علاج کروا سکیں۔ بخار اور کھانسی کی دوا کے لیئے بھی شہر جانا پڑتا ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر، ہمارے دیہات میں صحت کی سہولیات اور حالات ابتر ہیں۔ خدشہ ہے کہ اگر وقت پر کوئی قدم نہ اٹھایا گیا تو یہ کسی المیے کا سبب نہ بن جائے۔

صحت تو ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔ جس سے ہمارے علاقے کے لوگ محروم ہو رہے ہیں۔ لہٰذا میری آپ سے گزارش ہے کہ اس مسئلے کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور جلد از جلد ہمارے دیہات میں مرکز صحت کا قیام عمل میں لایا جائے اور ڈاکٹرز اور نرسوں کے عملے کا بندوبست کیا جائے۔

آپ کی عین نوازش ہو گی۔

مؤرخہ ۱۵ مئی ۲۰۲۲ء

درخواست گزار

اہلِ علاقہ

د-ذ-ذ

سوال نمبر6 (صفحہ نمبر2)

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 1)

مضمون نویسی

عنوان: پاکستان اور اقبالؒ کا شاہین

پاکستان، ہماری زمین، ہمارا گھر محض ایک زمین کا ٹکڑا نہیں ہے جو ہمیں ورثے میں ملا ہے۔ بلکہ اس زمین کے ٹکڑے کے لئے ہمارے آباء نے بہت جدوجہد کی ہے۔ اس جدوجہد میں نہ صرف بزرگوں بلکہ نوجوانوں نے بھی بھرپور حصّہ لیا۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان نام ہی کوشش کا ہے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔

بقولِ شاعر:

؎ یہ ہلال آب ہے تیغ خم دار کی
یہ ستارہ چمک ہے بختِ بیدار کی

پاکستان بنانے سے قبل مسلمان اور ہندو برصغیر میں ساتھ رہتے تھے۔ لیکن ہندو چونکہ اکثریت میں تھے اس لئے مسلمانوں کو نیچا دکھاتے اور ان پر ظلم و ستم کرتے۔ ایسے حالات میں **شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ** نے پاکستان، یعنی مسلمانوں کے لئے الگ وطن کے قیام کی تجویز دی۔ علامہؒ اقبال نے اس خطّے کے حصول کے لئے اپنے قلم کی طاقت سے مسلمانوں خصوصاً نوجوانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اقبال کے نزدیک **مسلمان نوجوان ایک شاہین** کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاہین کی چند خصوصیات ہیں جو اسے تمام پرندوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

شاہین کبھی مردار نہیں کھاتا۔ کبھی اپنا آشیانہ

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 2)

نہیں بناتا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسیرا کرتا ہے۔ اور بلند پرواز ہے۔ آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے حدف کا نشانہ بھی ایسے لیتا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔

اقبال یہی خصوصیات مسلمان نوجوان میں دیکھنا چاہتے تھے۔ برصغیر کے مسلمان جو انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ظلم کی چکی میں پس رہے تھے مگر اس کے باوجود حق آواز بلند نہیں کر رہے تھے، علامہ اقبال نے ان کو بیدار کیا۔ ان کو احساس دلایا کہ اگرچہ حالات سخت ہیں۔ لیکن تمہارا اپنا وجود تمہارے لئے امید کی ایک کرن ہے۔ بقول اقبال:

عصر نو رات ہے، دھندلا سا ستارہ تو ہے

علامہ اقبال نے نوجوانوں کو یہ احساس دلایا کہ وہ دراصل ایک شاہین ہیں۔ انھیں چاہئے کہ سستی اور کاہلی کو چھوڑیں بلکہ اپنے ذہن میں ایک الگ خطے کا خواب سجائیں۔ اور خواب کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کریں۔ جس طرح شاہین کبھی بھی تھک کر نہیں گرتا۔ ویسے ہی تمھیں بھی ہارنا نہیں ہے۔ بلکہ مسلسل کوشش کرنی ہے۔ بقول شاعر:

نہیں ہے تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

علامہ اقبال کی اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ نوجوان نہ صرف بیدار

بلکہ انھوں نے پوری کوشش اور لگن کے ساتھ پاکستان حاصل کرنے کی جدو جہد شروع کر دی۔ اس الگ وطن کے قیام کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ اور یہ اسی جدو جہد کا نتیجہ تھا کہ مسلمان **۱۴ اگست ۱۹۴۷ء** کو اپنے الگ وطن کے قیام میں کامیاب ہو گئے۔ اور یہ بات ثابت ہو گئی۔ بقول شاعر

؎ عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

مسلمانوں نے کسی تلوار، ڈھال، گولی، بندوق کا سہارا نہیں لیا۔ بلکہ پر امن طریقے سے ایک الگ وطن کے قیام کے لئے جدو جہد کی۔ اگرچہ علامہ اقبال اپریل ۱۹۳۸ء کو وفات پا گئے۔ لیکن ان کی تعلیمات مسلمانوں کی رہنمائی کا ذریعہ بنی رہیں۔ علامہ اقبال نے مسلمانوں کو یہ بات سمجھا دی تھی۔ کہ

؎ اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

تحریکِ پاکستان میں نہ صرف فلسفۂ شاہین بلکہ اقبال کے فلسفۂ خودی نے بھی بہت رہنمائی کی۔ اقبال کے نزدیک جب کوئی شخص اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے تو اس کو اللہ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ ایسا شخص مردِ مومن بن جاتا ہے جس کی زبان، ہاتھ، دل سب اللہ کی عکاسی کرتے ہیں۔

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 4) تاریخ سے یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ اگر قوم کے نوجوان ڈٹ جائیں۔ مل کر کوشش کریں تو وہ ناممکن سے ناممکن سر انجام دے سکتے ہیں۔ برصغیر میں الگ وطن کا قیام بظاہر ناممکن لگتا تھا۔ مگر جدو جہد کرنے کے بعد اللہ کے کرم سے یہ سب ممکن ہو گیا۔

آج پاکستان کو جن مشکلات کا سامنا ہے وہ اس وجہ سے ہیں کہ مسلمان نوجوانوں نے اقبال کے فلسفے کو بھلا دیا ہے۔ ہر کوئی سست اور کاہل اور عیاشی کی زندگی میں مگن ہے۔ بقول اقبال:

ہر کوئی مست مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلمان ہو یہ اندازِ مسلمانی ہے؟

اس وقت کی ضرورت ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو اقبال کے فلسفۂ شاہین سے آگاہ کیا جائے۔ انھیں اس بات کا احساس دلایا جائے کہ وہ سستی اور کاہلی کے لئے نہیں بنے۔ ان کے لئے یہ زمین ٹھہرنے کا مقام نہیں ہے۔ ان کا مقام تو آسمان کی بلندی ہے۔ وہ شاہین ہیں۔ ان کا مقصد بہت بڑا ہے۔ لہٰذا انھیں بلند پرواز ہونے کی ضرورت ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرنے سے کامیابی نہیں ملتی۔ ترقی وہی کرتے ہیں جو محنت کو اپنا شعار بناتے ہیں۔ بقول شاعر:

نوجوانوں کو میری آہ سحر دے — پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو بھی ہے میری — میرا نورِ بصیرت عام کر دے

اپنے وطن اور دینِ اسلام کی سربلندی کے لئے ضروری ہے کہ نوجوان اٹھ کھڑے ہوں اور محنت کریں۔ ایسا کرنے سے ایک دن ضرور ہر دنیا میں اسلام اور پاکستان کا نام روشن ہو جائے گا ان شاء اللہ